ادبیات

مشاہیر ادب کے کلام میں ذکر بے ثباتی

(از انیسویں صدی عیسوی تا بیسویں صدی عیسوی)

وسیم حیدر ہاشمی

دنیا کا کوئی بھی بشر کبھی بے ثباتی عالم سے انکار نہیں کرسکا۔ دنیا کے سرائے فانی ہونے کا ذکر جہاں کبھی مذہبی کتابوں میں ملتا ہے وہیں اس حقیقت کو انبیاء، صوفیا، پیروں، فقیروں اور اولیائے کرام سے لے کر عام انسانوں نے بھی صدق دل سے مانا اور قبول کیا ہے۔ خداوند کریم کی وحدانیت پر اکثر لوگوں میں تضاد وشبہ دیکھا گیا ہے مگر فنا چونکہ ہر کس وناکس نے دیکھی ہے اس لیے اس کے تئیں کوئی بشر کبھی شک وشبہ میں مبتلا نظر نہیں آیا۔ بس فنا کے وقت کو جاننا کسی کے بس کی بات نہیں۔ کسی کو دیر سے فنا ہونا ہے تو کوئی شے زود فنا ہوجاتی ہے۔

کچھ لوگوں کا یہ خیال کہ" اخلاقی مضامین صوفیانہ شاعری میں ہی ملتے ہیں" لیکن یہ بات درست نہیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اردو شاعری میں اخلاقیات کی علمبرداری میر انیسؔ کا حصہ ہے۔ چونکہ فلسفۂ بے ثباتی عالم بھی درس اخلاق کا اہم جز ہے اس لئے اس کا ذکر بھی یہاں ناگزیر ہے۔ صنف شاعری کے سلسلہ میں گوئٹے کا یہ قول ہے کہ" ادب میں کوئی صنف اس وقت تک عظیم نہیں بن سکتی جب تک اس کا موضوع عظیم نہ ہو۔" اس قول کے پیش نظر یہ کہا جاسکتا ہے کہ اردو شاعری کے عام موضوعات میں صرف واقعہ کربلا ہی وہ موضوع ہے جسے ہر نظر سے عظیم کہا جاسکتا ہے اور یہ ایک ناقابل تردید حقیقت بھی ہے کہ اردو میں اخلاقی شاعری کا جب تذکرہ ہوگا اس کا سب سے درخشاں باب کربلا کے عنوان سے کی گئی شاعری ہی میں بڑے حسن وخوبی سے نظر آئے گا۔ اور اس میں کسی ایک مسلک کے شاعر کی قید نہیں۔ اس موضوع کے تحت اقبالؔ، غالبؔ، میر انیسؔ، جوشؔ اور اسی پائے کے دوسرے شعراء کے کلام میں اعلیٰ پیمانے کا درس تصوف نظر آئے گا۔ چونکہ کربلا میں حضرت امام حسینؑ کا مقصد عظیم تھا اس لیے شعراء کے یہاں احساسات کے ضمن میں جو کچھ بھی بیان کیا گیا ہے وہ عظمتوں کے اونچے درجہ پر فائز ملے گا۔ اخلاقیات کے سلسلہ میں اپنے ایک مقالے" کلام انیس اور اخلاقی قدریں" میں بیگم صالحہ عابد حسین رقم طراز ہیں:

''یہ قدریں ہیں خدا شناسی و خدا پرستی، عقیدہ و ایمان، دیانت و شرافت، حق پرستی و عفو و کرم، ایثار و قربانی، شجاعت و جاں بازی، وفا و جاں نثاری، صبر اور استقلال، راضی بہ رضا رہنے کا حوصلہ رشتوں کی پاس داری اور انسانیت کا درس، خلوص و محبت اور پھر حق کی راہ میں جان قربان کر دینے کا وہ جذبہ جو شہادت کی منزل تک پہونچا سکتا ہے۔ شہادت یعنی سر دار بھی صرف حق کا نام لینا اور حق کے لیے جان تک قربان کر دینا۔ یہ وہ قدریں ہیں جن کو فنا نہیں کیا جا سکتا ہے۔ جو دب دب کر ابھرتی ہیں اور اپنی سچائی منوالیتی ہیں، جس کو انیسؔ نے زیادہ تر بالواسطہ یعنی اپنے کرداروں کی سیرت اور اخلاق میں اجاگر کر کے اور کہیں کہیں بلا واسطہ پیش کیا ہے''۔[۱]

اخلاقی قدروں میں عجز و انکساری کا بالواسطہ نمونہ میر انیسؔ کے یہاں ملتا ہے جس کی مثال ہندوستان تو کیا عالمی ادب میں بھی مشکل ہے۔ مثال کے طور پر وہ موقع جب میدان کربلا میں حضرت امام حسینؑ کی ملاقات اس غریب الوطن مسافر سے ہو جاتی ہے جو زیارت نجف اشرف اور قدم بوسی آستانہ حسینی کی غرض سے گھر سے نکلا تھا اور راہ بھول کر کربلا کی طرف آنکلا تھا۔ وہ حسینؑ کو پہچانتا نہ تھا۔ حسینؑ نے اس شخص سے اپنا تعارف کچھ اس طرح کرایا کہ عجز و انکساری کی اس سے بہتر مثال ناممکن ہوگی۔ نہ سلاست میں کمی نہ بلاغت میں اور روانی ایسی کہ ہر لفظ کی ترکیب سے خالص انسیت جھلکے ملاحظہ ہو:

یہ تو نہیں کہا کہ شہہ مشرقین ہوں
مولیٰ نے سر جھکا کے کہا میں حسینؑ ہوں

ٹھیک اسی طرح جب انیسؔ کا مقصد بلا واسطہ کہنا ہو تو بھی انداز بیان میں وہی حسن و خوبی اور عجز و انکسار نظر آئے گا جو اخلاقی شاعری کی عالمی مثال ثابت ہوتا ہے۔ دو شعر ملاحظہ ہوں:

کبھی برا نہیں جانا کسی کو اپنے سوا ہر یک ذرے کو ہم آفتاب سمجھے ہیں

خاکساری نے دکھائی رفعتوں پر رفعتیں اس زمیں سے واہ کیا کیا آسماں پیدا ہوئے

دنیا میں شاید ہی کوئی ایسا ادیب یا شاعر گزرا ہو جس نے بے ثباتی کو اپنا موضوع نہ بنایا ہو۔ بیشتر شاعروں اور ادیبوں نے اپنے اپنے انداز سے اس مضمون کو قلم بند کیا ہے۔ ویسے بھی شاعری تو

۱۔ انیس شناسی، گوپی چند نارنگ، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی بار دوم، ۲۰۰۰ء، ص ۴۶

جذبات کے اظہار کا وسیلہ ہے جیسا کہ علامہ شبلی نعمانی نے موازنہ انیس و دبیر میں لکھا ہے کہ:

''شاعری کس چیز کا نام ہے؟ کسی چیز، کسی واقعہ، کسی حالت، کسی کیفیت کو اس طرح بیان کیا جائے کہ اس کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جائے۔ دریا کی روانی، جنگل کی ویرانی، باغ کی شادابی، نسیم کے جھونکے، دھوپ کی سختی، گرمی کی تپش، جاڑوں کی ٹھنڈک، صبح کی شگفتگی، شام کی دلآویزی، یا رنج وغم، غیظ وغضب، خوشی ومحبت، افسوس وحسرت، عیش وطرب، استعجاب وحیرت، ان چیزوں کا اس طرح بیان کرنا کہ وہ کیفیت دلوں پر چھا جائے، اسی کا نام شاعری ہے''۔[۱]

شبلی نعمانی نے شاعری کی جو تعریف پیش کی ہے اسے میر انیس کی شاعری کا نثری ماخذ کہا جاسکتا ہے اور بے شک وہ مکمل ہے مگر اس مقالے کے عنوان کے تحت صرف ویرانی، سختی، رنج وغم اور استعجاب وحسرت ہی زیر غور ہیں۔

دیگر ہندوستانی زبانوں کے مدمقابل یوں تو اردو کی عمر بہت کم ہے مگر اس کے باوجود بے ثباتی عالم پر جتنا کچھ اردو میں ملتا ہے وہ اس کی عمر کے لحاظ سے بہت وقیع ہے خاص کر اردو نثر کے مقابلے نظم میں۔ اردو شاعری میں اس مضمون پر تو کئی شعراء نے ایک دو شعر ایسے کہہ دیئے ہیں کہ عالمی ادب بھی اس کا جواب پیش نہیں کرسکتا۔ مثلاً استاد ذوق کا یہ شعر:

لائی حیات آئے قضا لے چلی چلے
اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے

ذوق کے اس شعر کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں بے ثباتی کے ہمراہ شروع سے آخر تک انسان مجبور اور محض بے چارگی کا پیکر نظر آتا ہے۔ مسئلہ جبر واختیار پر اس سے بہتر شعر ملنا مشکل ہے۔

بہادر شاہ ظفر نے جب بے ثباتی عالم کا ذکر کیا تو سب سے پہلے انسان کی لمبی زندگی کی ایک خاص حد مقرر کرتے ہوئے ہندوستانی محاورے کی ضمن میں ایک شعر یوں پیش کیا کہ اس نے ذہن کے لاشعور میں ایک مستقل مسکن بنالیا۔

عمر دراز مانگ کے لائے تھے چار دن
دو آرزو میں کٹ گئے دو انتظار میں

۱۔ موازنہ انیس و دبیر۔ اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ۔ بار سوم۔ ۲۰۰۳ء، ص ۷۔۲۳۶

جہاں ظفر نے انسانی زندگی کے طول وعرض کو چار روز میں سمیٹتے ہوئے یہ کہا کہ اس کا نصف خواہشات و آرزوؤں کی نذر ہوجاتا ہے وہیں باقی کا نصف ان خواہشات کے پورا ہونے کے انتظار میں ختم ہوجاتا ہے ظفر کے بعد درگا سہائے سرور جہان آبادی نے بے ثباتی عالم کا ذکر کرتے ہوئے انسان کی لمبی زندگی کو دو روزہ کہا اور بہت خوب کہا:

کرے نہ عمر دو روزہ یہ سرکشی کہہ دو
کہ خاک کا ہے یہ پتلا بشر نہیں ناری

ہر چند کہ ظفر اور سرور نے ایک ہندوستانی محاورے کی ترجمانی کرتے ہوئے زندگی کو دو روزہ اور چہار روزہ کہہ کر بڑے حسن خوبی سے اپنا نظریہ پیش کیا مگر اس نہج سے ہٹ کر بابائے سخن میر انیس نے زندگی کو دو یا چہار روزہ کہنے کے بجائے حیرت انگیز طور پر تین روزہ کہا، جبکہ انیس سے قبل یا آج تک کسی شاعر یا ادیب نے زندگی کو سہ روزہ نہیں کہا تھا۔ انیس نے ہر تین دن کا حساب ایسی خوبصورتی سے پیش کیا کہ عقل دنگ رہ گئی۔ فصاحت، بلاغت، روانی، ترکیب اور شعریت ایسی بھرپور کہ سامع داد دینا بھول کر عرصہ تک غور کرتا رہے۔

تین دن کی زندگانی دیکھ لی
بچپنا، پیری، جوانی، دیکھ لی

جتنے بھی مشاہیر شعرا ہیں ان میں اکثر وبیشتر غزل گو ہیں اور چونکہ بے ثباتی بھی غزل کا عنوان ہے اس لیے ان لوگوں کے یہاں اس عنوان کے اشعار خوب مل جاتے ہیں ۔ بے ثباتی عالم پر میر تقی میر نے اتنے اچھے اشعار کہے ہیں کہ جو از خود زباں پر چڑھے ہوئے ہیں۔ مثلاً

جس سر کو غرور آج ہے یاں تاج وری کا — کل اس پہ یہیں شور ہے پھر نوحہ گری کا
آفاق کی منزل سے گیا کون سلامت — اسباب لٹا راہ میں یاں ہر سفری کا
لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام — آفاق کی اس کارگہ شیشہ گری کا
تک میر جگر سوختہ کی جلد خبر لے — کیا یار بھروسہ ہے چراغ سحری کا

یا پھر انہیں کے چند دوسرے اشعار:

ہر صبح مرے سر پر اک حادثہ نیا ہے
پیوند ہو زمیں کا، شیوا ہے آسماں کا

اُگتے تھے دشت بلبل و دامان گل بہم
صحن چمن نمونہ یوم الحساب تھا

اتنے منعم جہاں میں گزرے ہیں
وقت رحلت کے کس لئے زر تھا

آیا جو واقعہ میں درپیش عالم مرگ
یہ جاگتا ہمارا دیکھا تو خواب نکلا

میرؔ کا یہ تصور کہ ان کا گزر کسی ویرانے یا قبرستان سے ہونا اور کسی کے کاسۂ سر کا ان کے پیر سے ٹکرا جانا، بے ثباتی عالم کا بے مثل نمونہ ہے:

کل پانوں ایک کاسۂ سر پہ جو آگیا
یکسر وہ استخوان شکستہ سے چور تھا
کہنے لگا کہ دیکھ کے چل راہ بے خبر!
میں بھی کبھو کسو کا سر پر غرور تھا

میرؔ کی زندگی ایسی پر آشوب تھی کہ قدم قدم پر حادثات زمانہ سے دوچار ہوئی اور انہوں نے اپنی شاعری میں انہیں تجربات کو عبرت کا نمونہ بنا کر پیش کیا۔

نام آج کوئی یاں نہیں لیتا ہے انہوں کا
جن لوگوں کے کل ملک یہ سب زیر نگیں تھا
کہا میں نے گل سے ہے کتنا ثبات
کلی نے یہ سن کر تبسم کیا

عہد جوانی رو رو کاٹا پیری میں لی آنکھیں موند
یعنی رات بہت تھے جاگے، صبح ہوئی آرام کیا

اسی طرح انہوں نے مسئلہ جبر و اختیار کو نمونۂ عبرت بنا کر پیش کیا ہے:

ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی
چاہے ہیں سو آپ کرے ہیں، ہم کو عبث بدنام کیا

کل چمن میں گل و سمن دیکھا
آج دیکھا تو باغ بَن دیکھا

اس موج خیز دہر میں ہم کو قضا نے آہ
پانی کے بلبلے کی طرح سے مٹا دیا

شہاں کہ کحل جواہر تھی خاکِ پا جن کی
انہیں کی آنکھوں میں پھرتے سلائیاں دیکھیں

بہت نا آشنا تھے لوگ یاں کے
چلے ہم چاردن رہ کر جہاں میں

سب سرگزشت سن چکے اب چپکے سو رہو
آخر ہوئی کہانی مری، تم بھی سو رہو

درج بالا اشعار کے مطالعہ سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ میرؔ کی غزلوں میں صرف اعلیٰ درجہ کا تغزل نہیں بلکہ دوسرے رنگ بھی نمایاں حیثیت رکھتے ہیں اور بے شک، ان تمام رنگوں میں حسن تغزل کے بعد بے ثباتی کو ہی اولیت حاصل ہے۔

طنز و مزاح، غم اور خوشی کا اظہار، حب الوطنی، جام و مینا حسن تغزل اور بے ثباتی عالم، فلسفۂ رنج و ملال، تفکر و تصوف منظر نگاری وغیرہ اردو شاعری کے عام رنگ ہیں۔ مشاہیر شعراء میں ایسے کم ہی ملیں گے جنہوں نے اپنی شاعری کا عنوان درج بالا میں سے صرف ایک یا دو کو بنایا ہو۔ اب حکیم مومن خاں مومنؔ کو ہی لے لیجئے۔ ان کا کلام حسن و عشق اور لذت دنیا سے عبارت ہے تاہم وہ بے ثباتی

عالم جیسے اہم موضوع سے صرف نظر نہ کر سکے۔ بے ثباتی پر انہوں نے بہت کم اشعار کہے ہیں۔ جن میں کچھ درج ذیل ہیں:

اس چمن زار کا حسرت سے نظارہ کر لے
اے نگہ دیدۂ ہر سو نگراں ہونے تک

آسماں فتنہ کچھ ایسا نہیں اے اہل جہاں
کوئی باقی نہیں رہنے کا اماں ہونے تک

کیسی حسرت سے اے سبک روحی
دیکھے ہے دیدہ حیات ہمیں

ہر ادیب اور شاعر کا اپنا الگ مزاج ہوتا ہے، جسے اس کی تحریر اور کلام سے پہچانا جاتا ہے۔ اسے دوسرے لفظوں میں اگر یوں کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ اشعار کی کیفیت شاعر کے حقیقی مزاج کا آئینہ ہوتی ہے۔ لیکن ان میں چند ایسے بھی ہیں جن کی شخصیت ہشت پہلو ہوتی ہے۔ انہوں نے زندگی کے بیشتر پہلوؤں کو اپنی نوک قلم سے مختلف طریقہ سے سجایا سنوارا ہے۔ ان لوگوں میں ڈاکٹر اقبالؔ، مرزا غالبؔ اور نظیرؔ اکبر آبادی بڑی اہمیت کے حامل ہیں جنہوں نے شاعری کے مختلف عنوانات کے ساتھ بے ثباتی دنیا پر بھی قلم اٹھایا اور جو کچھ بھی کہا، بہت خوب کہا۔ ان لوگوں میں نظیرؔ اکبر آبادی کا انداز ان کے ہمعصروں اور دوسرے شعرا سے الگ اور نیا ہے۔ نظیرؔ نے اپنی بیشتر نظمیں مختلف عنوانات پر لکھی ہیں اور اپنے انوکھے انداز میں عام بیان میں، لکھنوی نزاکت اور تکلفات سے پاک اور متروک لفظوں کے استعمال کی وجہ سے پہلے تو انہیں اردو میں نمایاں مقام رکھنے والوں نے قبول ہی نہیں کیا۔ یہ لوگ نظیرؔ کی زبان کو بازاری زبان کہا کرتے تھے۔ نظیرؔ کے بارے میں اس طرح کا خیال رکھنے والوں میں حالیؔ، آرزو اور شیفتہؔ جیسے بڑے شاعر بھی شامل تھے۔ اس کے باوجود نظیرؔ کی نظمیں انہیں کے زمانے میں عام لوگوں میں کافی مقبول ہو چکی تھیں اور بعد میں اردو ادب اور نقد شاعری میں بھی ان کے کلام کی بھرپور پذیرائی ہوئی۔ پروفیسر کلیم الدین احمد جیسے نقاد نے بھی کلام نظیرؔ پر تبصرہ کرتے ہوئے اعتراف کیا کہ ''نظیرؔ ادب کے آسمان کا درخشاں ستارہ ہے''۔

نظیر کی مقبول ترین نظموں میں "شب برأت، عید بسنت، ہولی بلدیو جی کا میلا اور راکھی کے ساتھ مفلسی، موت، روٹیاں اور بنجارہ نامہ" بھی خوب سراہی گئیں۔ اب ان نظموں میں سے چند اشعار پیش ہیں جن میں بے ثباتی کا ذکر بڑی خوبصورتی سے کیا گیا ہے:

جب آکر قضا نے کھلایا اجل کا گل
کام آئی تب کسی کی خوشی نہ شور و غل

وہ شخص جو تھے سات ولایت کے بادشاہ کی
حشمت میں جن عرش سے اونچی تھی بارگاہ
مرتے ہی ان کے تن ہوئے گلیوں کی خاک راہ
اب ان کے حال پر بھی یہی بات ہے گواہ
جو خاک سے بنا ہے، وہ آخر کو خاک ہے

گر ایک کو ہزار روپیہ کا ملا کفن
اور اک یونہی پڑا رہا بے کس برہنہ تن
کیڑے مکوڑے کھا گئے دونوں کے تن بدن
دیکھا جو میں نے آن تو سچ ہے یہی سخن
جو خاک سے بنا ہے، وہ آخر کو خاک ہے

جتنے درخت دیکھو ہو بوٹے سے تابہ جھاڑ
بڑ، پیپل، آم، نیب، چھوارا، کھجور، تاڑ
سب خاک ہوں گے جب کہ فنا ڈالے گی اکھاڑ
کیا بوٹے ڈیڑھ ہاتھ کے کیا جھاڑ کیا پہاڑ
جو خاک سے بنا ہے، وہ آخر کو خاک ہے

"بنجارہ نامہ" بذات خود ایک علامتی نظم ہے۔ جس کا ایک ایک مصرعہ عبرت دنیا اور فنا کا ایسا مرقع

ہے جس کی نظیر ملنا مشکل ہے۔ صرف پہلا بند ملاحظہ ہو:

ٹک حرص و ہوا کو چھوڑ میاں مت دیس بدیس پھرا مارا
قزاق اجل کا لوٹے ہے دن رات بجا کر نقارا
کیا بدھیا، بھینسا بیل، شتر، کیا گوئیں پلا سر بھارا
کیا گیہوں، چاول، موٹھ، مٹر، کیا آگ دھواں کیا انگارا
سب ٹھاٹھ پڑا رہ جائے گا، جب لاد چلے گا بنجارا

بے ثباتی کے عنوان پر تھوڑے بہت اشعار قریب قریب سب کے یہاں مل جاتے ہیں مگر تسلسل سے ۳۰، ۴۰ اشعار بہت کم شاعروں کے یہاں ملتے ہیں۔ قانی، انیس اور شوق کی ہی مانند سرور جہاں آبادی بھی اس میدان میں وہ نام ہے کہ اگر بے ثباتی عالم پر کوئی مضمون یا مقالہ لکھا جائے اور سرور جیسے عالی قدر شاعر کو نظر انداز کر دیا جائے تو یہ نہ صرف سرور کے ساتھ ناانصافی ہوگی بلکہ مقالے میں بھی ایک خلاء سا محسوس ہوگا کیونکہ ان کی ایک مکمل نظم ہی "بے ثباتی" دنیا ہے، یہ نظم انہوں نے اسی محبت کرنے والی بیوی کی نا وقت موت سے متاثر ہو کر کہی ہے جو صرف ۲۶ سال کی عمر میں انہیں داغ مفارقت دے گئی تھی۔ نظم کا ایک ایک مصرعہ سرور کی تڑپ کی نمائندگی کرتا ہے۔ اور مطلع ہی اس طرف متوجہ کرتا ہے۔

جگر کے داغ نے کی ہے چمن کی تیاری
کہو کہ دیدۂ تر جوئے خوں کرے جاری

۳۷ اشعار کی اس نظم کو جوں کا توں پیش کرنے کا موقع نہیں ہے اور اشعار کا انتخاب بھی مشکل ہے۔ بہر حال مندرجہ ذیل اشعار دل خیز، بردل ریز، کے طور پر پیش کیے جاتے ہیں:

زمیں نے نور کے پتلے چھپا لیے کیا کیا — کہ سو رہے ہیں لحد میں بتان زنگاری
زمانہ صید تھا جن کے خدنگ غمزہ سے — ہوئے شکار اجل وہ غزال تاتاری
وہ مہ جمال جو بالائے بام سوتے تھے — اب ان پہ خواب اجل زیر خاک ہے طاری
بنا کے نقش فلک نے مٹا دیے لاکھوں؛ — عجیب طرح کا ہے کچھ طلسم زنگاری
عدم سے مرگ کا سودا چکانے آئے ہیں — سرا میں ٹھہرے ہوئے کچھ جو ہیں یہ بیوپاری
کہاں سے آئے ہیں ہم اور کہاں کو جاتے ہیں — رہی نہ غفلت دنیا میں اتنی خودداری

رہا نہ کچھ زن و فرزند و مال و زر کا خیال   قضا کے آتے ہی نیند ایسی ہوگئی طاری
اجل کہیں میں زمانہ عدو فلک دشمن   کرے مقابلہ کس کس سے جان بیچاری
زمانہ آنکھ جھپکتے ہی ہوگیا تاریک   وہ شب کا خواب ہوا دن کی جو تھی بیداری
گڑھے میں گور کے جاگیردار سوتے ہیں   فلک نے چھین لیا منصب جہاں داری
یہی ہے راہ فنا جس میں روز و شب غافل   نفس کی آمد و شد کا ہے قافلہ جاری
بہت غریب لٹے شاہراہِ ہستی میں   سنی اجل نے کسی کی نہ گریہ و زاری
دیا نہ ان کو کفن پیر زال دنیا نے   قبائے زر تھی کبھی جن کے دوش پر بھاری
کہاں وہ مسند جم ہے کہاں وہ بزم نشاط   کہاں ہے قصر فریدوں کی اب وہ تیاری
پتہ نہیں ہے کہ رستم کی ہڈیاں ہیں کدھر   رہی نہ سام و نریماں کی اب وہ خودداری
کہاں ہے خسرو و بہمن کی بارگاہ رفیع   کہاں قباد کی، ہوشنگ کی جہاں داری
اڑا کے تخت سلیماں کو لے گئے دم میں   قضا کے جھونکوں میں تھی اتنی تیز رفتاری
تمام عمر رہا سامنا قضا کا سرور   گئی نہ وہ جو کلیجے پہ چوٹ تھی کاری

میر تقی میر، میر انیس، شوق، مرزا دبیر اور دوسرے سرفہرست شعرا کی مانند یہاں پر سرور نے بھی اپنی بات منوانے کی خاطر حسینوں، جاگیرداروں، مسافروں، غریب الوطن، عالی منصب امراء، جمشید، دارا، رستم، سام خسرو، حضرت سلیمانؑ وغیرہ کے اوج و طنطنہ کا ذکر کرتے ہوئے ان کی بھی آخری منزل قبر بتائی ہے۔ یہاں صرف عام گنہگاروں کا ذکر نہیں بلکہ ان کی طرف بھی اشارہ ہے جو پیکر نور یعنی رسولؐ نبیؑ اور امامؑ تھے، انہیں بھی موت اور قبر کا سامنا کرنا پڑا۔ ان کے علاوہ یہاں وہ صاحب کمالات بھی فنا کی نذر ہوگئے۔ جو یوسف لقا تھے، حسین وجمیل تھے، بادشاہ تھے منصب دار اور جانے کن کن دنیاوی خوبیوں سے آراستہ وپیراستہ تھے۔ زندگی کے حقیقی انجام سے واقفیت کے باوجود انسان حقیقت کی طرف سے چشم پوشی ہی اختیار کئے رہتا ہے۔

اس پوری نظم میں طرح طرح کی تشبیہات وتلمیحات کے ذریعے بے ثباتی کی طرف بڑی خوبصورتی سے اشارہ کیا گیا ہے لفظوں کی بندش، تراکیب کا استعمال سلاست اور روانی اس نظم کو بلند درجہ پر فائز کرتی ہیں۔ یہ نظم اپنے موضوع، پیش کش اور زبان وبیان کے اعتبار سے اردو ادب میں ناقابل فراموش ہے۔

ان مشاہیر کے بعد ذہن بے اختیار ان شعرا کی طرف از خود مبذول ہوجاتا ہے جو ایک خاص عنوان کے لحاظ سے اس میدان میں سدرۃ المنتہیٰ پر ہی نظر آئے ہیں۔ شاعری کے اس خاص میدان میں نہ تو ان سے قبل کوئی اس مقام پر تھا اور نہ ہی آج تک کوئی ان کی خاک کو بھی پہونچ سکا۔

میری قدر کر اے زمین سخن
تجھے خاک سے آسمان کردیا
سبک ہوچکی تھی ترازوئے شعر
مگر ہم نے پلہ گراں کردیا

یہ قطع صرف شاعرانہ تعلّی نہیں ہے بلکہ حقیقتاً اردو شاعری میں ان کے وقیع اضافے کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیبؔ نے دریا کو کوزے میں بند کردیا۔ وہ کہتے ہیں کہ: ''مرثیہ، اردو شاعری کی سب سے شریفانہ صنف ہے''۔اور میر انیسؔ کی خصوصیت پر روشنی ڈالتے ہوئے علامہ شبلی نعمانی جیسے صاحب نظر اور تنقید نگار کو بھی یہ کہنا پڑا کہ:

''میر انیسؔ کے کمال کا اگر چہ جس قدر مجھے اعتراف ہے شاید ہی کسی اور کو ہوگا''۔[۱]

مرثیہ سے چونکہ زیر بحث عنوان کا گہرا تعلق ہے۔ اس لیے کسی بھی مرثیہ گوشاعر کے یہاں اس موضوع کے اشعار کی تعداد زیادہ اور بہت زیادہ بھی ہوسکتی ہے۔ ہاشم علی سے لے کر میرؔ، سوداؔ اور میر انیسؔ تک کے کلام میں اس عنوان کے اشعار کی کثرت ہے۔ میر انیسؔ کی چند رباعیاں پیش خدمت ہیں:

دنیا بھی عجب سرائے فانی دیکھی
ہر چیز یہاں کی آنی جانی دیکھی
جو آکے نہ جائے، وہ بڑھاپا دیکھا
جو جاکے نہ آئے وہ جوانی دیکھی
آغوش لحد میں جبکہ سونا ہوگا
جز خاک، نہ تکیہ نہ بچھونا ہوگا
تنہائی میں آہ کون ہووے گا انیسؔ
ہم ہوں گے اور قبر کا کونا ہوگا

۱- موازنہ انیس ودبیر، ص ۲۶۷

جس دن کہ فرق روح و تن میں ہوگا
آنا مشکل اس انجمن میں ہوگا
نازاں نہ ہو رخت نو پہن کر غافل
اک روز یہی جسم کفن میں ہوگا

غافل تجھے کیوں خواہش دنیا و دنی ہے
پیوند کفن ہر کوئی درویش و غنی ہے
جو قاقم و سنجاب پہنتے تھے ہمیشہ
سوتے ہیں تہہ خاک، گلے میں کفنی ہے

اب گرم خبر موت کے آنے کی ہے
غافل تجھے فکر آب و دانے کی ہے
ہستی کے لئے ضرور اک دن ہے فنا
آنا ترا دلیل جانے کی ہے

ہے عالم فانی کی عجب صبح عجب شام
کہ غم کبھی شادی کبھی ایذا کبھی آرام

شبنم سے جو وجہ گریہ پوچھی تو کہا
رونا فقط اپنی بے ثباتی کا ہے

برسوں سے یہی رنگ گلستان جہاں ہے
جس گل پہ بہار آج ہے کل اس پہ خزاں ہے

بے ثباتی کے سلسلہ میں سلام اور رباعیات کے ساتھ مرثیہ کا ذکر ناگزیر ہے ورنہ مضمون ادھورا رہ جائے گا، انیس کے مرثیہ کے چند یادگار بند پیش خدمت ہیں:

آیا بناہ ہستی انساں میں جب خلل　　رونا ہے بے فضول کہ ہے سعی بے محل
جاتا ہے کوئی آج جہاں سے تو کوئی کل　　روؤ کہ خاک اڑاد نہیں چھوڑتی اجل
نے فاطمہؓ رہیں نہ امیرؓ عرب رہے
ہمشکل جن کے یہ ہیں وہ دنیا میں کب رہے

جو خلق میں تھے صاحب تخت و علم و تاج　　نوبت یہ ہوئی ہے کہ نشاں ان کے نہیں آج
شاہان جہاں فخر سے دیتے تھے جنہیں باج　　وہ قبر میں ہیں سورۂ الحمد کے محتاج
سکہ ہے نہ وہ اور نہ وہ تاج نگیں ہیں
دولت تو خزانے میں ہے خود زیر زمیں ہیں

اولاد کا گلشن نہ عزیزوں کا چمن ساتھ　　یاور نہ مصاحب، نہ محبان وطن ساتھ
نے ماں ہے نہ فرزند نہ بھائی نہ بہن ساتھ　　دنیا کے کل اسباب سے ہوتا ہے کفن ساتھ
آجاتی وہاں موت جہاں گھر نہیں ہوتا
بہتوں کو کفن تک بھی میسر نہیں ہوتا

بھائی نہ تو کام آئے گا اس وقت نہ فرزند　　عرصہ نہیں کھل جائے گا جب آنکھ ہوئی بند
وہ کام کرو جس سے خدا ہوئے رضامند　　ہشیار کہ ہونا ہے تمہیں خاک کا پیوند
پیری کی بھی مدت ہے جوانی کی بھی حد ہے
آرام گہ شاہ و گدا کنج لحد ہے

خداوند کریم کی ہر تخلیق کا انجام مقرر ہے۔ وہ انسان ہو یا حیوان، شجر و حجر و جبل ہو یا سمندر و دریا، زمین ہو یا آسمان، کسی کو بقاء نہیں۔ ہاں وقت و حالات کا علم صرف اللہ کو ہے۔ دوسروں کا بد سے بدتر انجام دیکھنے کے بعد بھی انسان اپنی موت سے بے خبر رہتا ہے اور اکثر سگ دنیا بن کر جیتا ہے۔ قرآن شریف میں بھی خدائے بزرگ و برتر نے صاف لفظوں میں اعلان فرمایا ہے کہ:

وَالْعَصْرِ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ پھر بھی ہر کس و ناکس صرف اس لیے غفلت کی زندگی گذار رہا

ہے کہ جتنا یقین اسے اپنی موت کا ہے اس سے زیادہ بھروسہ اس بات کا ہے کہ ابھی اس کا انجام حقیقی دور اور بہت دور ہے جبکہ نبیوںؑ اور اولیائے کرام سے لے کر صوفیوں تک نے اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ انیسؔ فرماتے ہیں:

کیا سخت گھڑی ہوگی اجل آئے گی جس دم — کھنچ کھنچ کے ہر ایک رگ سے نکلنے لگے گا دم
کیا دیکھیں گے اک ایک کو حسرت سے بصد غم — اتنی بھی زباں ہل نہ سکے گی کہ چلے ہم
سب کیلئے اک روز یہ تکلیف دھری ہے
اس پر بھی یہ غفلت ہے عجب بے خبری ہے

بھائی نہیں اپنے ہیں، نہ ہی ہے پسر اپنا — بے گانے ہیں سب ہوئے گا جس دم سفر اپنا
نے مال، نہ اسباب، نہ زیور، نہ زر اپنا — دو گز ہے کفن، قبر کا کونا ہے گھر اپنا
کچھ ساتھ بجز بے کسی و یاس نہ ہوگا
رہ جائیں گے سب دور کوئی پاس نہ ہوگا

اس زیست پہ پھولو نہ اجل کو بھی کرو یاد — گھر سیکڑوں یاں سیل فنا نے کیے برباد
دنیا میں عمارت نہ بنا کر ہو کوئی شاد — اس قالب خاکی کی عجب سخت ہے روداد
کل اوج پہ جو لوگ تھے، وہ زیر زمیں ہیں
ہے خاک کا ڈھیرا، نہ مکاں ہیں نہ مکیں ہیں

کس کس گل رنگیں کی نہ اس باغ میں تھی دھوم — اک آن میں شبنم کی طرح ہوگئے معدوم
دکھلا رہی ہے رنگ عجب ہستی موہوم — کیا قصد ہے گلچین اجل کا نہیں معلوم
اس باغ میں جس سرو کو دیکھا تو رواں ہے
جس گل پہ بہار آج ہے کل اس پہ خزاں ہے

جب کبھی بے ثباتی کے عنوان سے دبستان لکھنؤ کا ذکر ہوگا تو پنڈت برج نارائن چکبست کا نام از خود ذہن میں آجائے گا۔ جنہوں نے اس عنوان پر اپنے ایک بھرپور شعر کے ذریعے زندگی اور موت

کے ہفت خواں کو نہایت منطقی استدلال کے ساتھ چند لفظوں میں حل کر دیا ہے۔

زندگی کیا ہے؟ عناصر میں ظہور ترتیب
موت کیا ہے؟ انہیں اجزاء کا پریشاں ہونا

یہ شعر زندگی اور موت کی ایسی تعریف ہے جسے کافی حد تک ''سائنٹفک'' بھی کہا جاسکتا ہے اور اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا ہے کہ یہ مختلف مذاہب کے ماننے والوں کے لئے بھی قابل قبول ہے۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ اس شعر کے دونوں مصرعے ہندی کے مندرجہ ذیل دوہوں سے استفادہ کا نتیجہ ہے تو کچھ غلط نہ ہوگا۔

پہلا دوہا: شتی۱، جل۲، پاوک۳، گگن۴، سمیرا۵
پانچ تتو۶، یہ ادھم ے، سریرا۸ زندگی کیا ہے؟ عناصر میں ظہور ترتیب

دوسرا دوہا: یہ پنچ بھوت۹، میں نشورتن۱۰
نشور بھوتوں میں لین ۱۱ ہوا موت کیا ہے؟ انھیں اجزا کا پریشاں ہونا

ہندی کے پہلے دوہے میں عناصر کے اجزاء ترکیبی کے ظہور پذیر ہونے اور دوسرے میں ان کے انتشار کا ذکر کرکے ازل سے ابد تک کی ترجمانی چکبستؔ نے جس حسن خوبی سے کی ہے وہ لاجواب ہے۔

دبستان لکھنؤ کے شعرا میں میر انیسؔ بے مثل ہیں اور اس میں کوئی شک نہیں کہ بے ثباتی عالم پر انیسؔ کے سکیڑوں تو کیا ہزاروں شعر ملتے ہیں جن میں اکثر بے مثل ولاجواب ہیں لیکن ان سب سے ہٹ کر اب میں اسی دبستان کے ایک ایسے شاعر کے چند اشعار پیش کرتا ہوں جس کی شاعری کے رنگ میں نہ تو یاسیت وقنوطیت ہے اور نہ بے ثباتی دنیا۔ میرا اشارہ مرزا شوقؔ لکھنوی کی طرف ہے۔ شوقؔ نے دوسرے مشاہیر شعرا کے مقابلے بہت کم لکھا۔ شاید دامقؔ جونپوری نے ایسے ہی شعرا کے لئے یہ شعر کہا تھا:

کیا ضروری ہے کہ دیوان کا دیوان لکھیں
ایک شعر ایسا کہو، زندہ جاوید رہے

مرزا شوقؔ اپنی تمام تر شاعری کے باوجود شہرت کی ان بلندیوں تک ہرگز نہ پہونچتے اگر انہوں نے

۱-زمین ۲-پانی ۳-آگ ۴-آسمان ۵-ہوا ۶-عناصر ۷-تخلیق ۸-جسم ۹-اجزا عناصر
۱۰-مدغم یا خلاصہ می شوم ۱۱-اردو مرثیہ نگاری، ام ہانی اشرف، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ ۱۹۹۲ء

"مثنوی زہرِ عشق" نہ لکھی ہوتی۔ یا اگر یوں کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ اگر شوق کے مجموعہ کلام سے اس مثنوی کو ہٹا دیا جائے تو ان کا شمار بھی اس دور کے عام شعرا میں سمٹ کر رہ جائے گا اب زہرِ عشق کا وہ مقام ملاحظہ فرمایئے جب ہیرؤن آخری بار ہیرو سے ملنے آتی ہے اور رات بھر اس کے ساتھ رہ کر خودکشی کے ارادے کا اظہار کرتی ہے اور ہیرو کو صبر کی تلقین کرتی ہے۔ یہ وہ مقام ہے جب زندگی کی تمام لذتیں اپنا حسن کھو چکی ہیں۔ اسے دنیا کے تمام مسائل کا حل موت کی آغوش میں نظر آتا ہے۔ یہ داستان صدیوں سے دہرائی جارہی ہے جو آج بھی محبت کرنے والے اسے دہراتے رہتے ہیں۔ مرزا شوق نے شاعرانہ فنکاری کے ساتھ بے ثباتی دنیا کا ذکر بڑے موثر انداز میں کیا:

جائے عبرت سرائے فانی ہے — مورد مرگ نوجوانی ہے
اونچے اونچے مکان تھے جن کے — آج وہ تنگ گور میں ہیں پڑے
کل جہاں پر شگوفہ و گل تھے — آج دیکھا تو خار بالکل تھے
جس چمن میں تھا بلبلوں کا ہجوم — آج اس جا ہے آشیانہ بوم
بات کل کی ہے نوجواں تھے جو — صاحب نوبت و نشاں تھے جو
آج خود ہیں نہ ہے مکاں باقی — نام کو بھی نہیں نشاں باقی
غیرت حور منہیں نہ رہے — ہیں مکاں گر تو وہ مکیں نہ رہے
جو کہ تھے بادشاہ ہفت اقلیم — ہوئے جا جا کے زیرِ خاک مقیم
کوئی لیتا نہیں اب اس کا نام — کون سی گور میں گیا بہرام
اب نہ رستم نہ سام باقی ہے — اک فقط نام نام باقی ہے
کل جو رکھتے تھے اپنے سر پہ تاج — آج ہیں فاتحہ کو وہ محتاج
تھے جو خودسر جہان میں مشہور — خاک میں مل گیا سب ان کا غرور
عطر مٹی کا جو نہ ملتے تھے — نہ کبھی دھوپ میں نکلتے تھے
گردش چرخ سے ہلاک ہوئے — استخواں تک بھی ان کے خاک ہوئے
تھے جو مشہور قیصر و مغفور — باقی ان کے نہیں نشان قبور
تاج میں جن کے ٹکتے تھے گوہر — ٹھوکریں کھاتے ہیں وہ کاسۂ سر
رشکِ یوسف تھے جو جہاں میں حسین — کھاگئے ان کو آسمان و زمیں

ہر گھڑی منقلب زمانہ ہے — یہی دنیا کا کارخانہ ہے
ہے نہ شیریں نہ کوہ کن کا پتہ — نہ کسی جا ہے تل دمن کا پتہ
بوئے الفت تمام پھیلی ہے — باقی اب قیس ہے نہ لیلیٰ ہے
صبح کو طائران خوش الحان — پڑھتے ہیں کل من علیھا فان
موت سے کس کو رستگاری ہے — آج وہ کل ہماری باری ہے
زندگی بے ثبات ہے اس میں — موت عین حیات ہے اس میں

اردو شاعری میں جب بھی اخلاقی قدروں کا ذکر ہوتا ہے تو متعدد شعراء کے نام سامنے آجاتے ہیں اور یہ فیصلہ کرنا دشوار ہوجاتا ہے کہ کس شاعر نے اس موضوع کے ساتھ انصاف کیا ہے۔ اخلاقی قدروں کو برتنے کے سلسلے میں ہر ناقد اور مبصر کے سوچنے کا طریقہ جدا ہے۔ عبدالقادر سروری نے جدید اردو شاعری میں اپنی رائے کا اظہار اس طرح کیا ہے:

''فارسی کے اتباع میں اردو نے بھی بہت سے اخلاقی شاعر پیدا کیے لیکن میر درد کے سوا کسی کو اختصاصی درجہ نصیب نہ ہوسکا... میر درد کی پوری شاعری اعلیٰ تصوف کے نکات سے بھری ہوئی ہے''۔[۱]

اس میں کوئی شک نہیں کہ درد کے کلام میں جابہ جا اخلاقی شاعری کے بہترین نمونے ملتے ہیں مگر یہ کہنا کہ اخلاقی شاعری کے سلسلے میں درد کے سوا کسی کو اختصامی درجہ نصیب نہ ہوسکا'' میری دانست میں درست نہیں''۔

ہر چند کہ خواجہ میر درد کا شمار ان خاص شعرا میں ہوتا ہے جنہوں نے بہت کم لکھا۔ بمشکل تمام ڈھائی ہزار اشعار اردو میں اور تقریبا اتنے ہی فارسی میں۔ اپنے کلام کے آئینہ میں وہ ایک ایسے شاعر ہیں جنہوں نے جو کچھ بھی لکھا معیاری لکھا۔ ان کی چھوٹی سے چھوٹی یا بڑی سے بڑی غزل کا ایک بھی شعر کمتر درجہ کا نہیں ملے گا۔ یہ بہت بڑی بات ہے کیونکہ عام طور پر بڑے شعراء کے یہاں بھی ہلکے اور غیر معیاری اشعار مل ہی جایا کرتے ہیں۔ یہ ماننا پڑے گا یا تو درد نے غیر معیاری اشعار کہے ہی نہیں یا انہیں اپنے دیوان میں شامل نہ ہونے دیا۔ درد کے برعکس ایسے بہت سے شعرا ہیں جنہوں نے کمتر درجہ کے اشعار کہے اور اعتراض کے باوجود اسے اپنے دیوان سے خارج نہ کیا۔ مثال کے طور پر فانی بدایونی کو ہی لے لیجئے جنہوں نے نشان دہی و اعتراض کے باوجود ایسے اشعار اپنے دیوان سے نہ

۱- اردو مرثیہ نگاری، ام ہانی اشرف، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ ۱۵، ۱۹۹۲ء

نکالے۔ اس سلسلہ میں مندرجہ ذیل بیان بہت اہمیت رکھتا ہے۔

''اس دیوان میں بہت سے ایسے اشعار بھی ملیں گے جو فانی جیسے سخنور کے شایان شان نہیں ہیں۔ راقم الحروف نے اس کی باضابطہ اطلاع فانی کو دے دی تھی لیکن موصوف نے اسے ''غیر متعلق'' قرار دے کر اپنا فیصلہ برقرار رکھا۔[۱]

مندرجہ بالا بیان کے پیش نظر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اشعار کی تعداد کو فوقیت دینے کے بجائے میر درد نے معیار کو فوقیت دی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کا دیوان معیاری اشعار کا دیوان بنا پھر بھی کسی کا یہ کہنا کہ ''اخلاقی شاعری میں میر درد کے سوا کسی کو اختصاصی درجہ نصیب نہ ہو سکا'' قطعی جانب دارانہ خیال ہے۔

ہر چند کہ مولانا الطاف حسین حالی کو مرثیہ کے بعض اجزا پر اعتراض ہے اور انہوں نے مرثیہ پر بھی سخت تنقید کی ہے پھر بھی میر انیس کی اخلاقی شاعری پر نقد کرتے ہوئے انہوں نے ایک ایماندار اور صاف گو ناقد ہونے کا ثبوت دیتے ہوئے پوری ادبی دیانت داری کے ساتھ لکھا ہے کہ:

''اسی خاص طرز کے مرثیہ کو اگر اخلاق کے لحاظ سے دیکھا جائے تو بھی ہمارے نزدیک اردو شاعری میں اخلاقی نظم کہلانے کا مستحق صرف انہیں لوگوں کا کام ٹھہر سکتا ہے۔ بلکہ جس اعلیٰ درجہ کے اخلاق ان لوگوں نے مرثیہ میں بیان کیے ہیں ان کی نظیر فارسی بلکہ عربی شاعری میں بھی مشکل سے ملے گی...[۲]

خواجہ الطاف حسین حالی کے علاوہ جن دیگر محققین نے میر انیس پر تحقیق کی ہے بے شک ان میں پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیب کا نام بھی سرفہرست ہے اور ان کی رائے میر انیس کی معاملے میں بہر حال مستند سمجھی جاتی ہے۔ میر انیس کی اخلاقی شاعری کے بارے میں وہ ''روح انیس'' میں کچھ اس طرح رقم طراز ہیں:

''اخلاقی شاعری کے اعتبار سے انیس کے مرثیوں کا پایہ بہت بلند ہے۔ ان کے تمام کلام میں بلند اخلاق کی ایک لہر دوڑی ہوئی ہے۔ جن اخلاق فاضلہ کی تعلیم انیس کے مرثیوں سے ہوتی ہے وہ اخلاق و نصائح کی کسی کتاب سے یا وعظ و پند کے ذریعے ممکن نہیں۔ نفس انسانی کی انتہائی شرافت کے نقشے جن موثر پیرایوں میں کھینچے ہیں ان کا جواب ممکن نہیں''۔[۳]

۱۔ مقدمہ دیوان فانی اردو شاعری پر ایک نظر، رشید احمد صدیقی، ص ۵۵، ۵۴، باقیات فانی بدایونی، ایم آر پبلی کیشنز، نئی دہلی ۲۰۰۳ء

۲۔ مقدمہ شعر و شاعری خواجہ الطاف حسین حالی ۳۔ کلام انیس پر مختصر تبصرہ، سید مسعود حسن رضوی ادیب اردو مرثیہ نگاری ام ہانی اشرف، ص ۱۸۰، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ۔ ۱۹۹۲ء

مختصر یہ کہ جو لوگ مراثی انیسؔ کو صرف اس نظریہ سے دیکھتے ہیں کہ وہ محض حضرت امام حسینؑ سے مذہبی عقیدت رکھنے والوں کے لئے ہیں انہیں اس قسم کی عینک اتار کر انیسؔ کے کلام پر دوبارہ غور کرنا پڑے گا تب کہیں جا کر ایسے لوگ ایک خاص نتیجہ پر ضرور پہونچیں گے اور انیس کو صرف مرثیہ گو نہ کہہ کر حقیقتاً اردو شاعری کا روشن منارہ کہیں گے۔

درج بالا اقتباسات اور مثالوں پر غور کیا جائے تو عبدالقادر سروری کا میر دردؔ کے سلسلہ میں یہ دعوی کہ ''میر دردؔ کے سوا کسی کو اختصاصی درجہ نصیب نہ ہوسکا'' پوری طرح باطل ہو جاتا ہے۔ ہاں اگر سروری صاحب نے درد کے لئے یہ جملہ ان کے ہمعصروں کے سلسلہ میں کہا ہوتو اسے درست مانا جا سکتا ہے مگر ایسا نہیں بلکہ یہ جملہ پوری اردو شاعری کے لئے کہا گیا ہے۔

اس سے قبل ہم فانی کی شاعری پر بات کر رہے تھے جو درد کے کلام سے سروری کے خیالات تک پہونچ گئی۔ میں پھر واپس اپنی خاص گفتگو کی طرف پلٹتا ہوں...!

میر تقی میر سے کچھ ہٹ کر فانی بدایونی کی غزل گوئی ہے۔ وہ زندگی کی ہر سانس کو عالم نزع میں جیتے ہیں، جس نے ان کی شاعری کو عبرت سے زیادہ قنوطیت کا مرقع بنادیا ہے۔ ان کی بیشتر شاعری موت کفن، میت، قبر اور فنا سے عبارت ہے۔ جس طرح میرؔ نے ''آپ بیتی کو جگ بیتی'' بنا کر پیش کیا، کم وبیش اسی طرح فانیؔ کی شاعری بھی زندگی کے ہر نشیب و فراز سے گزرتی نظر آتی ہے جس شاعر نے زندگی کو جتنے قریب سے دیکھا اور محسوس کیا ہوگا، اس کے کلام میں زندگی کی اتنی ہی بھرپور جھلک نظر آئے گی۔ پھر بھلا ایسے شاعر سے بے ثباتی کا عنوان کیسے چھوٹ سکتا تھا جس نے اپنا تخلص ہی فانیؔ اختیار کیا ہو۔ ''کلیات فانی'' کا دیباچہ لکھتے ہوئے قاضی عبد الغفار نے ان کی شاعری پر اپنے جذبات کا اظہار کچھ اس طرح سے کیا ہے:

''زندگی شعر ہے مگر زندگی کا ہر جذبہ شعر نہیں۔ صرف غم شعر ہے۔ تازہ پھولوں کا حسن شعر کا ادنیٰ مقام ہے مگر مرجھائے ہوئے پھول کی گزری ہوئی رعنائی اور مٹا ہوا رنگ حقیقی شعریت کا ارفع ترین مقام ہے'' [1]

درج بالا بیان کو نظر میں رکھ کر فانیؔ کے اس زبان زد قطع پر غور کیجئے تو ایک الگ لطف محسوس ہوگا:

۱- دیباچہ کلیات فانی، قاضی عبد الغفار، ص ۵

اک معمہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا
زندگی کا ہے کو ہے، خواب ہے دیوانے کا
ہر نفس عمرِ گزشتہ کی ہے میت فانیؔ
زندگی نام ہے مر مر کے جیئے جانے کا

یا درج ذیل شعر:

بنیادِ جہاں کیا ہے؟ مجبورِ فنا ہونا
سرمایہ ہستی ہے محرومِ بقا ہونا

اسی عنوان کے تحت فانیؔ نے چھوٹی بحر میں ایک مکمل نظم ''دارِ فانی'' کے نام سے کہی ہے۔ نظم کے چند اشعار بطورِ مثال پیش خدمت ہیں:

روتے آئے دنیا والے — و اللہ مال خزانے والے
دارا، جمؔ، اسکندر کیا تھے — آنے والے جانے والے
کھو بیٹھے اب نام و نشاں تک — شوکت شان دکھانے والے
ہو گئے اب روباہ سے کمتر — شیر سے آنکھ ملانے والے
کوئی نہ ٹھہرا وقت جب آیا — چل دیے آخر جانے والے
جو نہ گئے سو آکے رہیں گے — سب ہیں مسافر خانے والے
دولت، ثروت، عزت، حشمت — چھوڑ گئے سب جانے والے
تج بیٹھے جو عمر کی دولت — اب نہیں ہرگز پانے والے
دارِ فنا ہے دنیا فانیؔ — آنے والے ہیں جانے والے

اس کے علاوہ بھی فانیؔ نے اس عنوان کے تحت بہت سے اشعار کہے ہیں جن میں سے چند پیش خدمت ہیں:

ہم نہ تھے کل کی بات ہے فانیؔ — ہم نہ ہوں گے، وہ دن بھی دور نہیں

چمن میں آئے شب گزری صبح چل نکلے — ملی تھی کیا ازل میں زندگانی ہم کو شبنم کی

قطرہ قطرہ رہتا ہے، دریا سے جدا رہ سکنے تک جو تاب جدائی لا نہ سکے وہ قطرہ فنا ہو جاتا ہے

درج بالا مضمون کو آخر تک پڑھ لینے کی بعد ایک بات تو ایک دم صاف ہو گئی کہ اس عنوان کے تحت اردو میں بہت کچھ لکھا گیا۔ خاص کر میر انیس نے اس عنوان پر خوب شعر کہے کیونکہ ان کا تو میدان ہی مرثیہ ہے مگر ایک ایسا شاعر جس نے اپنی تمام زندگی میں بہت کم لکھا ہو، شوق کے محض ۲۳ مسلسل اشعار ہی کافی ہیں، جس کا ہر شعر بے ثباتی عالم کے لحاظ سے دعوت فکر دیتا ہے اور اس عنوان پر موازنے کے لئے کسی بھی عالمی ادب پر تنہا بھاری ہے۔